مزمل نے جواب دیا۔ ''مطلب یہ ہے کہ یہ محض سکیم ہے۔ ہم اسے عمل میں نہیں لا سکتے۔''

''کیوں نہیں لا سکتے؟'' سبطین کا لہجہ درشت ہو چلا تھا۔

مزمل بے اعتنائی سے بولا۔ ''بس لا نہیں سکتے۔''

سبطین اور گرمایا۔ ''بس لا نہیں سکتے۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر عزم ہو تو کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔''

مزمل نے اسی سرد مہری سے جواب دیا۔ ''عزم ہو تو سب کچھ کیا جا سکتا ہے۔ مگر ہم اس کے بل پر ایک ہفتہ وار پرچہ نہیں چلا سکتے۔''

سبطین نے اسی جوش سے جواب دیا۔ ''ہماری ایک چھوٹی سی ناکامی سے اصول نہیں ٹوٹ سکتا۔''

''مگر ہماری چھوٹی چھوٹی بہت سی ناکامیوں سے ایک اور اصول قائم ہوتا ہے۔''

''وہ کیا؟''

''وہ یہ کہ۔'' مزمل ایک لمحہ کے لیے رکا اور پھر بولا۔ ''خالی عزم محض ایک ڈھکوسلا ہے۔''

فیاض خاں رضائی تانے خاموش لیٹا تھا۔ اس نے اب تک اپنی کسی حرکت سے یہ ثابت نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مزمل کے آخری فقرے پر اس نے کمبل کا ایک کونہ الٹا۔ وہ چند لمحوں تک غور سے مزمل کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے کمبل میں منہ ڈھک لیا۔

سبطین بھی اب خاموش ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے والی دیوار پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی ٹھوڑی اس کے گھٹنوں پر آ ٹکی۔ تھوڑی دیر وہ یوں گھٹنوں پہ ٹھوڑی ٹکائے کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر اس نے گھٹنوں میں سر دے لیا نہ جانے وہ کتنی دیر یوں گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ کھٹر پٹر کی مسلسل آواز پہ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اجمل اور مزمل اپنا سامان سمیٹ رہے تھے۔ وہ ان کی نقل و حرکت خاموشی سے دیکھتا رہا۔ انہیں ٹوکنے کی اسے جرات نہ ہوئی۔ فیاض خاں کے کمبل کا کونہ ایک مرتبہ پھر اٹھا۔ وہ ڈیڑھ دو منٹ تک چپ چاپ اجمل اور مزمل کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔ ''مزمل اس وقت یہ کیا کر رہے ہو؟''

مزمل نے خشک سی آواز میں جواب دیا۔ ''بات یہ ہے کہ ہم سوچتے ہیں کہ'' مزمل رکا اور پھر بولا۔ ''ہم سوچتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے اور اگر کچھ نہیں کر سکتے تو وقت خواہ مخواہ ضائع...'' مزمل فقرہ پورا نہ کر سکا۔

فیاض خاں اجمل سے مخاطب ہوا۔ ''اجمل تم بھی؟''

اجمل نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ''جی۔''

فیاض خاں ٹکٹکی باندھے مزمل اور اجمل کے چہروں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس کی نگاہیں خلا میں جم گئیں۔ کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ شام ہو چلی تھی۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ دھندلکا آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا اور چیزوں کے خدوخال دھندلے پڑتے جا رہے تھے پگھلتے جا رہے تھے' بلکہ پوری فضا کو ہی دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ پگھل رہی ہے۔ دور کی کسی مسجد سے اذان کی آواز اونگھتی رینگتی یوں آ رہی تھی جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر دو قدم چلتا ہے اور تھک کر بیٹھ جاتا ہے۔ اذان کی آواز کبھی کبھی ذرا تیز ہو جاتی اور پھر مدھم ہو جاتی اور اتنی مدھم ہوتی کہ اسے ہوا کی لہریں سامعہ تک پہنچنے سے پہلے جذب کر لیتیں۔ مزمل اور اجمل نے بستر کاندھے پہ رکھے' ہاتھوں میں صندوقچے سنبھالے' خاموشی سے سبطین اور فیاض خاں کو سلام کیا اور سر نیوڑھائے آہستہ سے باہر نکل گئے۔ فیاض خاں اور سبطین تھوڑی دیر تک خاموش انہیں جاتے ہوئے دیکھتے رہے اور جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو فیاض خاں نے کمبل میں منہ لپیٹ لیا اور سبطین نے گھٹنوں میں سر دے دیا۔

شام کے سائے اور گہرے ہو گئے۔ گلشن لالٹین جلا کر لائی اور سٹول پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''سپو میاں کھانا لے آؤں۔''

''لے آؤ۔'' اس نے گھٹنوں سے سر اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

گلشن بولی۔ ''پردے مزمل میاں اور اجمل میاں جنیں کدھر چلے گئے۔''

سبطین گھٹنوں میں سر دیئے دیئے بولا ''وہ گئے۔''

''گئے؟ کاں گئے؟'' گلشن کے کان کھڑے ہوئے۔

''وہ گئے۔ کھانا لے آؤ۔'' سبطین کا سر بدستور گھٹنوں میں تھا۔

گلشن بھونچکی رہ گئی۔ اس نے پہلے بڑی حیرت سے سبطین کو دیکھا۔ پھر فیاض خاں کی چارپائی پہ نظر ڈالی اور پھر دبے پاؤں باہر نکل گئی۔

گلشن جب کھانا لے کر آئی تو سبطین نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اور فیاض خاں کو آواز دی۔ ''فیاض خاں کھانا کھا لو۔'' فیاض خاں خاموشی سے اٹھا' کلی کی' ہاتھ دھوئے اور کھانے پہ ڈٹ گیا۔ وہ نوالے آج بھی بڑے بڑے لے رہا تھا۔ لیکن جس تیزی سے وہ نوالوں پہ نوالے کھایا کرتا تھا۔ وہ تیزی آج غائب تھی۔ وہ آہستہ سے ایک بڑا سا نوالہ توڑتا شوربے میں ڈبوتا اور منہ میں رکھ لیتا۔ وہ اسے چباتا رہتا' چباتا رہتا اور جب نوالہ بالکل ختم ہو جاتا۔ پھر دوسرا نوالہ توڑتا۔ کھانے کے دوران میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ دونوں نے

خاموشی سے کھانا کھایا' کلی کی اور پڑ ہے۔

سبطین کی بیٹھک میں صبح آج کچھ بہت ہی خاموشی سے آئی۔ مزمل اور اجمل جو منہ اندھیرے اٹھ کر ساری بیٹھک کی فضا میں جاگ باگ پیدا کر دیتے تھے رخصت ہو چکے تھے فیاض خاں کہاں تو تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر ٹہلنے نکل جایا کرتا تھا۔ کہاں اب اس نے یہ طور اختیار کیا تھا کہ پوستیوں کی طرح دن چڑھے تک کمبل میں منہ لپیٹے پڑا رہتا تھا۔ کمرے میں ایک اداس سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کتابیں اور کاغذ بے ترتیبی سے چٹائی پہ بکھرے پڑے تھے۔ اجالا پھیلتا جا رہا تھا۔ مگر دھیرے دھیرے اور بہت سہم سہم کر اس احتیاط سے کہ کوئی اس کے قدموں کی آہٹ نہ سن لے۔ مگر سبطین نے اس کے قدموں کی آہٹ سن لی تھی کئی مرتبہ اس نے منہ کھول کر بھی دیکھا مگر اس اداس جالے سے ڈر کر پھر منہ ڈھک لیا اور فیاض خاں تو شاید ابھی صبح کے وجود کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔ ایک فراغت کے احساس کے ساتھ وہ منہ لپیٹے پڑا تھا۔ اجالا ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ مگر ایک مرتبہ بھی تو اس نے منہ کھول کر باہر دیکھنے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ البتہ جب اخبار والا اخبار ڈال کر گیا تو سبطین کو چار و نا چار اپنے جاگ اٹھنے کا ثبوت دینا پڑا۔ اخبار پڑھنے کا اس کا وہ اشتیاق آج بالکل ختم ہو چکا تھا۔ پھر بھی وہ رسم کو تو نبھا ہی رہا تھا۔ اس نے بیدلی سے خبروں پہ نظر ڈالنی شروع کر دی۔ مختلف سرخیوں کو وہ پڑھتا چلا گیا۔ مگر اسے پتہ نہ چل سکا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ کئی ایک سرخیوں پر جب اس نے دوبارہ نظر ڈالی تو اسے احساس ہوا کہ اس نے پہلے انہیں پڑھا ہی نہیں تھا۔ ایک طول طویل خبر کو وہ بہت غور سے پڑھتا چلا گیا۔ لیکن اسے ختم کر چکنے کے بعد وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ وہ خبر کس بارے میں تھی۔ بعض خبروں کو اس نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا۔ ایک سرخی کے الفاظ کے متعلق اسے یوں محسوس ہوا کہ ان کی روشنائی پھیل گئی ہے اور وہ آپس میں گڈ مڈ ہو گئے ہیں۔ البتہ ایک کونے میں ایک مختصر سی ایک کالمی خبر پر اس کی نظریں ٹھٹھکیں۔ اس نے بڑی توجہ سے اسے پڑھا۔

''مظفر آباد۔ ۱۷ جنوری

اطلاعات مظہر ہیں کہ ہندوستانی فوجیں برابر ایسے جارحانہ اقدامات کر رہی ہیں جو معاہدہ ترک جنگ کے خلاف ورزی ہیں۔ آج خبر آئی ہے کہ انہوں نے کل اس قسم کی جارحانہ اقدام پھر کیا اور ایک شخص کو ہلاک کر دیا۔ انہوں نے الزام لگایا ہے کہ یہ شخص ان کے مقبوضہ علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مقتول کی سیدھی کلائی پر تلوار کا نشان کھدا ہوا ہے اور اس کے نیچے اس کا نام ''کالے خاں'' کھدا ہے۔''

سبطین کئی منٹ تک بالکل چپ بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ بولا۔ لو بھئی کالے خاں مارا گیا۔''

فیاض خاں نے منہ کھول کر سبطین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ سبطین نے جواب میں اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ فیاض خاں نے خبر خود تلاش کر کے پڑھی۔ دوسری خبریں پڑھنے کی اس نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس نے خاموشی سے اخبار سرہانے رکھ دیا اور پھر منہ کمبل میں لپیٹ لیا۔

رفیا جب کمرے میں آیا تو پہلے سبطین اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔ ''ارے بھئی رفیا وہ تمہارا کالے خاں تھا نہیں...''

رفیا چونکا۔ ''ہاں جی؟ اس کی کوئی خبر آئی ہے؟''

''ہاں خبر آئی ہے... وہ مارا گیا۔''

رفیا کی آنکھیں بھٹی کی بھٹی رہ گئیں۔ وہ مجسم سوال بنا سبطین کو دیکھ رہا تھا۔ مگر جب سبطین نے کوئی اور بات نہ کی تو وہ آخر خود ہی بولا۔ ''سپو میاں دے تو پنڈی گیا تھا۔''

''وہاں سے وہ کشمیر چلا گیا۔ وہاں ہندوستانی فوج نے اس کے گولی مار دی۔''

رفیا دیر تک بت بنا کھڑا رہا۔ پھر وہ آہستہ سے وہاں سے نکل گیا۔

کوٹھری میں پہنچتے ہی اس نے علن کو بڑی یاس آمیز آواز میں مخاطب کیا۔ ''یار علن وہ... کالے خاں...'' اس کی آواز رندھ گئی۔

علن گھبرایا۔ ''کیا ہوا ہے؟''

''کالے خاں مارا گیا۔''

''کالے خاں مارا گیا؟ کون کہوے ہے بے؟''

''سپو میاں... اخبار میں آیا ہے۔''

علن خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ ''کیا لکھا ہے؟''

''لڑائی میں گولی لگ گئی۔''

رفیا کا منہ دوسری طرف ہو گیا۔ علن کی طرف پیٹھ کئے وہ چپ چاپ دیر تک بیٹھا رہا علن کی زبان بھی بند تھی۔ پھر وہ بہت آہستہ سے بولا۔ ''میں نے وسے پہلے ہی منع کیا تھا۔''

پھر خاموشی چھا گئی۔ رفیا علن سے نگاہ بچا کر سامنے والی دیوار کو بے معنی طور پر گھور رہا تھا۔ علن کی نگاہیں خلا میں جمی ہوئی تھیں۔

ان کے جسم بے حس وحرکت ہو چکے تھے۔ان کی زبانیں سل گئی تھیں۔دو خاموش بے حس وحرکت سائے!

۱۸ جنوری

کالے خاں مارا گیا۔اس خبر نے مجھ پہ کچھ عجیب ہی اثر کیا ہے۔اس شخص کو دیکھ کر مجھے کبھی یہ گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس بے جگری سے موت ٹکرا سکتا ہے۔اس زمانے میں لوگ یا تو اچانک ہیرو بن جاتے ہیں یا پھر میری ہی نظر میں فتور ہے۔اس شخص کو میں روز دیکھتا تھا۔اس کی چال ڈھال میں مجھے کبھی کسی غیر معمولی پن کا احساس نہیں ہوا۔اور ایک روز وہ خاموشی سے میرے پاس سے اٹھا اور موت پر جھپٹ پڑا۔اس کی موت کی خبر سن کر مجھے آج حضرت علی کا ایک فقرہ رہ رہ کر یاد آیا۔''یا تو موت مجھ پہ پھٹ پڑے گی یا میں موت پہ پھٹ پڑوں گا۔'' موت پہ پھٹ پڑنے والے آج بھی موجود تھے۔بس میں انہیں پہچان نہیں سکا۔میں یہ سمجھا تھا کہ میرے اردگرد بے حس اور بزدل لوگوں کا ہجوم ہے مگر اس وقت جب موت دلی پہ پھٹ پڑی تھی۔ایک شخص چپ چاپ میری آنکھوں کے سامنے اٹھا اور موت پہ پھٹ پڑا۔شیر و موت پہ پھٹ پڑا اور کالے خاں گولنداز بن گیا۔پھر ایک شخص میرے برابر سے اٹھا اور اس نے موت کو جا لیا موت کو پچھاڑنے والے موت کو یوں پچھاڑ دیتے ہیں۔ایک میں ہوں کی عمر بھر موت کو پچھاڑنے کے لیے خم ٹھونکتا رہا اور اب خود میرے پچھڑنے کی نوبت آ گئی ہے۔

۱۹ جنوری

آج میں دن بھر منہ لپیٹے پڑا رہا۔ایک دو مرتبہ میں نے ارادہ بھی کیا۔کہ ذرا اٹھوں اور باہر گھوم آؤں۔مگر گھومنا تو درکنار اب تو چارپائی سے اٹھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔میں اپنے آپ میں ایک عجیب سی نقاہت محسوس کر رہا ہوں۔یہ جسم کی نقاہت تو ہرگز نہیں ہے۔بس مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جذباتی طور پر تھک کر چور ہو چکا ہوں۔کچھ عجب عالم ہو گیا ہے۔اب میں شدت سے کوئی بات محسوس ہی نہیں کر سکتا۔کل کالے خاں کی موت کی خبر سنی۔یہ موت بھی دراصل اتنی ہی چونکانے والی تھی جتنی شیرو کی موت چونکانے والی تھی۔مگر میں اسے اس شدت سے محسوس ہی نہیں کر سکا۔دراصل ہر ہنگامے کی تان بال آخر جمود ہی پر ٹوٹتی ہے میں نے جیسی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے۔اس کا انجام بہرصورت یہی ہونا تھا۔مجھے اپنی زندگی کی اس شکست کا افسوس نہیں ہے۔افسوس یہ ہے کہ میں اتنے ہنگامے کے باوجود موت سے ٹکر نہیں لے سکا۔موت سے جیتنا تو خیر کون ہے۔شیرو اور کالے خاں بھی اپنے طنطنہ کے باوجود موت سے بچھڑ گئے۔مگر انہوں نے موت کے دانت ضرور کھٹے کر دیئے۔کچھ اسی شان سے میں بھی موت سے ٹکر لینا چاہتا تھا۔مگر وہ وقت گزر گیا اور اب میرے جسم میں میری روح میں ایک تھکن سرایت کرتی جا رہی ہے۔

۲۰ جنوری

آج صبح مجھ پہ عجب واردات گزری۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ سبطین چپ چاپ افسردہ سی صورت بنائے کسی سوچ میں گم ہے۔ پورے کمرے کی فضا میں اداسی رچی ہوئی تھی۔ یہ وہی کمرہ ہے۔ جہاں مزمل اور اجمل دن رات اخبار پہ جتے رہتے تھے اور جہاں بیٹھ کر سبطین کے تخیل اور زبان دونوں کو پر لگ جاتے تھے کمرے کی اس اداس فضا نے مجھ پہ عجب اثر کیا۔ میرا دل بھر آیا اور آنکھیں بھیگ گئیں۔ یہ کچھ بہت ہی عجیب ہی بات تھی۔ مگر آج کل تو مجھے روز کسی نہ کسی ایسے تجربے سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو میری فطرت کے خلاف ہے یا کم از کم جسے میں اپنی فطرت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ رونے کو ہمیشہ میں نے اپنی فطرت سمجھا۔ یہ کام میں نے سبطین کے لیے چھوڑ دیا ہے دراصل رونا نرم گرم طبیعتوں کو مشغلہ ہے۔ سبطین فطرتاً نرم مزاج ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بڑی آسانی سے زمانے سے سمجھوتا کر لیتا ہے۔ جس صورت حال کو وہ تین مہینے پہلے ناقابل برداشت تصور کرتا ہے۔ تین مہینے بعد وہ اس کے لیے قابل قبول بن جاتی ہے۔ اپنی ہر ناکامی میں ہو کوئی تسکین کا پہلو ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ تحریک کا بالکل پڑا ہو چکا ہے۔ اخبار بند ہو گیا۔ کارکن رخصت ہو گئے۔ آج سبطین سے یہ صدمہ برداشت نہیں ہوتا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ تین ماہ بعد وہ اس ناکامی کا جواز ڈھونڈھ لے گا اور خود فریبی کے لیے پھر سامان پیدا کرے گا۔ مگر مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ میں حالات سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا۔ یہ حالات کا اثر ہے کہ یہ میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ ورنہ یہ میری سب سے بڑی طاقت بھی ہو سکتی تھی۔

۲۲ جنوری

آج میں نے پھر اپنے آپ کو رونے پہ مائل پایا اور بغیر کسی وجہ کے بس یونہی جی چاہا کہ خوب روؤں' پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ میں سوچتا ہوں کہ یا اللہ کیا میرے مزاج کی کایا پلٹ جائے گی۔ میری طبیعت میں یہ سوز و گداز آخر کیسے پیدا ہوا۔ کیا واقعی ہر انسان کو زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پہ رونے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اتنا تو میں مانتا ہوں کہ بعض لوگوں کی افتاد کچھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ رونے سے ان کا جی ہلکا ہو جاتا ہے۔ ان کی روح کی کدورت دھل جاتی ہے۔ مگر ان لوگوں کی طبیعتوں میں ایک خاص قسم کی گھلاوٹ ہوتی ہے۔ میری طبیعت میں وہ گھلاوٹ نہیں ہے۔ میرے سینے پہ جو ایک بوجھ ہے۔ وہ یوں نہیں ہٹے گا۔ وہ آنسوؤں سے نہیں دھل سکتا۔ مگر یہ غبار کیسے دھلے گا۔ یہ میں نہیں جانتا۔ میری روح میں جو ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ اب اس نے مضمحل ہو کر ایک رینگتے ہوئے غبار کی شکل اختیار کر لی ہے یہ غبار آنکھوں کی راہ نہیں نکلے گا۔ اس کے نکاس کی جو راہ ہے۔ وہ یا تو میرے بس میں نہیں ہے یا میں اس سے واقف نہیں ہوں۔

۲۳ جنوری

رات مجھے بے تحاشا افسری کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت کچھ بہت افسردہ ہوگئی۔ افسری کا جب خیال آتا ہے تو بس یوں معلوم ہوتا ہے کہ اندر سے کوئی چٹکی لے رہا ہے۔ نہ جانے یہ کیا کیفیت ہے۔ یہ محبت کی کیفیت تو یقیناً نہیں ہے مگر میں اپنی ناکامی کا احساس ضرور چھپا ہوا ہے۔ یہ بھی آخر مغالطہ ہی نکلا کہ میں عورت کو شکست دے سکتا ہوں۔ مجھے دنیا کی ہر کمزور طاقت نے شکست دی۔ عورت بھی دنیا کی ایک کمزور طاقت ہے۔

افسری یوں جو کچھ بھی ہو مگر اس کے جسم کو دیکھ کر تو بس سبحان اللہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔ اس جسم کے آگے میں نہ تو خود جھک سکا اور نہ اسے اپنے آگے جھکا سکا۔ دراصل محبت سپردگی کا معاملہ ہے۔ وہ چیز نہ مجھ میں تھی نہ افسری میں تھی۔ یوں میں جانتا ہوں کہ اسے علق سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

افسری کے متعلق جب میں سوچتا ہوں تو دل کو کوئی مسلنے لگتا ہے اور کوئی چپکے چپکے افسردگی آمیز آواز میں کہتا ہے۔ ''زندگی ضائع ہوگئی۔ وقت بیت گیا۔'' زندگی واقعی ضائع ہوگئی۔ وقت بے شک بیت گیا۔

۲۶ جنوری

رفتہ رفتہ میری طبیعت ٹھکانے آ رہی ہے۔ میری طبیعت میں جو رقت کا مادہ پیدا ہو چلا تھا۔ اس پہ میں نے قابو پا لیا ہے۔ یوں اب بلاوجہ بلاسبب بیٹھے بٹھائے میرا دل بھر کر نہیں آتا۔ اب دوسری کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ میرا دل پتھر کا ہوتا جا رہا ہے۔ آج کل میں نت نئی کیفیتوں سے گزر رہا ہوں۔ یہ کیفیتیں میری سمجھ میں تو آتی نہیں ہیں۔ اللہ جانے مجھے کیا ہوا جا رہا ہے۔

۲۷ جنوری

اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھئے
گویا کوئی نگر ہو کسو کا لٹا ہوا

۲۸ جنوری

سینے پہ ایک مٹیالا بوجھ سا رکھا ہے۔ اس کے اثر سے دم بند ہوا جا رہا ہے اور یوں معلوم ہو رہا ہے کہ دل کی نبض ڈوبتی جا رہی ہے۔

۲۹ جنوری

آج ۲۹ جنوری ہے۔ جب مجھے تاریخ یاد آ جاتی ہے تو اطمینان سا ہوتا ہے کہ ابھی وقت کا احساس مجھ میں باقی ہے مگر یہ احساس آخر کب تک باقی رہے گا۔ ذہن کی عجب کیفیت ہے۔ ایک دھند سا اس میں بھرا ہوا ہے بلکہ مجھے تو ساری چیزیں ہی گرد میں اٹی ہوئی

معلوم ہوتی ہیں۔ چیزوں کا الگ الگ وجود میرے لیے ختم ہو چلا ہے۔ بس یوں لگتا ہے کہ ذروں کا ایک جلوس ہے جو دھیرے دھیرے چیزوں کو اپنی آغوش میں لے رہا ہے اور آگے بڑھ رہا ہے۔

۳۰ جنوری

نامے میں لوہو رو رو خط کھینچ ڈالے سارے
یہ میر بیٹھے بیٹھے تحریر کیا نکالی

حاضر کا احساس باقی ہے' دھندلا دھندلا ہی سہی۔ مگر ماضی کی کڑیاں بالکل گم ہو چکی ہیں۔ آج میں نے اپنی ڈائری الٹ پلٹ کر دیکھی تا کہ کچھ اپنی گزری ہوئی زندگی کا اتا پتا چلے۔ میں حیران رہ گیا۔ یہ اتنے بہت سے لفظ کہاں سے آئے؟ کس نے لکھے ہیں؟ میں نے لکھے؟ رونا تو میری فطرت کے خلاف ہے اور ان لفظوں میں جا بجا لہو رونے کے نشان ملتے ہیں۔ نہ رونے والے کیسے کیسے عجیب طریقوں سے روتے ہیں اور کتنے غیر محسوس ڈھنگوں سے روتے ہیں۔ لہو رونا اور خط کھینچنا' کیا میں عمر بھر یہی کرتا رہا ہوں۔ مگر یہ کیا طور ..... میں کہنا کیا چاہتا ہوں' چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ یہ ٹیڑھے میڑھے خط۔ یہ میری ڈائری کے الٹے سیدھے لفظ پگھل رہے ہیں' آپس میں غلط ملط ہو رہے ہیں۔ لہو روتے ہوئے مرتعش لفظوں کی قطار دھندلی پڑ رہی ہے' مٹ رہی ہے۔؟

کچھ یاد نہیں پڑتا کہ آج کیا تاریخ ہے اور کونسا مہینہ ہے۔ ممکن ہے۔ آج کوئی تاریخ نہ ہو اور کوئی مہینہ نہ ہو۔ وقت ختم ہو گیا ہے یا میں اس کے احساس سے محروم ہو گیا ہوں؟ اپنے اردگرد مجھے ایک مٹیالا غبار منڈلاتا نظر آتا ہے۔ اس مٹیالے غبار میں مجھے یوں دکھائی دے رہا ہے کہ گائے کے دو سینگ معلق ہیں اور ابھی ابھی کوئی مدوری سی چیز جو ان پہ ٹکی ہوئی تھی یکا یک غائب ہو گئی ہے۔

وہ تھکن جو میرے جسم اور میری روح میں رچ گئی تھی۔ اس کا احساس زائل ہو چلا ہے۔ اب مجھے یوں لگتا ہے کہ میرا جسم پتھر کا ہوتا جا رہا ہے۔ بھورے بھورے ڈراؤنی صورتوں والے بندر مجھ پہ لپک رہے ہیں اور میں انہیں چپ چاپ دیکھ رہا ہوں۔ میری مدافعت کی قوت زائل ہو چکی ہے۔ میرے دھڑ تک کا جسم پتھر کا ہو چکا ہے اور جمود کی کیفیت دھیرے دھیرے اوپر کی طرف بڑھ رہی ہے اور میرے نڈھال ہوتے ہوئے دل کو چھو لینا چاہتی ہے۔ کچھ گہن کی سی کیفیت ہے۔ گہن؟ چاند کو گہن لگ رہا ہے۔ چپ چاپ دھیرے دھیرے۔ میں گہنا رہا ہوں یعنی فیاض خاں گہنا رہا ہے۔ اس کی روح گہنا رہی ہے۔

◆◆◆